اس متن اور حاشیے میں اختیار کردہ موقف کا علمی محاسبہ کرتے ہوئے ہمارے ایک نہایت ہی قابلِ احترام بزرگ اور وقت کے بہت بڑے محقق عالمِ دین مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب نے حکمتِ قرآن ہی کے جنوری ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں "غلبۂ حال اور انبیائے کرام علیہم السّلام" کے عنوان سے اس پر بہت مفصّل تنقیدی گفتگو فرمائی ہے چونکہ اس موضوع پر مزید بحث کے لیے مندرجہ ذیل وجوہ سے آمادہ نہ تھا۔

(۱) اگرچہ مولانا سے شخصی طور پر متعارف نہ ہوں اور تاہنوز شرفِ ملاقات سے بھی محروم ہوں تاہم ان کی عظمت اور علمی مقام و مرتبے سے کافی متأثر ہوں اور عام طور پر ایک ہی موضوع پر ایسی مختلف الخیال دو طرفہ تحریرات سے بظاہر ایک تقابل کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو مولانا محترم کی نسبت قطعاً ناگوار تھی۔

(۲) خود مسئلہ بڑا نازک اور انبیائے کرام سے متعلق ہے مولانا کا مضمون پڑھنے کے بعد اپنی بات پر بھی شرح صدر باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے بھی مزید لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن آج سے دو تین مہینے پہلے یہ دونوں مضمون اتفاقاً پھر سامنے آگئے۔ دوبارہ پڑھنے پر محسوس ہوا کہ مولانا محترم تو اس مسئلے کی بہت زور و شور سے قطعی تردید فرماتے ہیں جبکہ ہمارے دوسرے اکابر کاملین پر غلبۂ حال کے کبھی کبھی واقع ہو جانے کے قائل نظر آتے ہیں اور سرِ دست اپنا حال یہ ہے کہ طبعی رجحان تو مولانا محترم کے موقف کی طرف ہے لیکن دلائل کی قوت دوسری طرف دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہ یقین تو اب بھی نہیں ہے کہ اس مسئلے کی ایسی دو ٹوک تنقیح ہو سکے گی کہ کوئی تردّد باقی نہ رہے تاہم دوبارہ چھڑنے پر مولانا کے قلم سے بہت سا قیمتی علمی مواد سامنے آجانے کی قوی اُمید ہے اس لیے مولانا محترم کے مضمون کے خاص خاص حصوں پر اپنی طالب علمانہ معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ چونکہ اس موضوع کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلا یہ کہ انبیاء علیہم السلام پر غلبۂ حال واقع ہو سکتا ہے کہ نہیں اور دوسرا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ غلبۂ حال کے قبیل سے ہے کہ نہیں۔ سو اسی ترتیب سے مولانا کے دلائل اور ان کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

مولانا فرماتے ہیں:

"غلبۂ حال ایک ذہنی کمزوری ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان عقائدِ حقّہ کے

خلاف بعض کفریہ فقرے زبان پہ لاتا ہے چونکہ جن حضرات کی مجموعی زندگی کتاب وسنّت کے مطابق ہوتی ہے ان کی زبان پہ ایسے فقروں کا آنا ان کی عام زندگی سے میل نہیں کھاتا اس لیے ان فقروں میں تاویل کر کے ان کی عام زندگی کے احترام کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ حفاظتِ الٰہی نہیں غلبۂ حال کی کمزوری سے محفوظ رکھتی ہے۔"

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ غلبۂ حال ایک انسانی کمزوری ہے اور انبیائے کرام علیہم السلام اس سے منزہ ہیں لیکن جبکہ یہ مسلّم ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات انسان ہی ہوتے ہیں اور دوسرے انسانی عوارض مثلاً سہو، نسیان، غم، پشیمانی وغیرہ ان کو بھی پیش آتے رہتے ہیں تو فقط غلبۂ حال کا عارضہ پیش آنا کیوں ناممکن ہے۔ ہاں تبلیغ احکام کے سلسلے میں غلبۂ حال سمیت ہر قسم کے عوارض سے بحفاظتِ الٰہی مامون ومصون ہوتے ہیں تاکہ فریضۂ رسالت کی کما حقہ ادائیگی میں کسی اشتباہ کا وسوسہ پیدا نہ ہو۔ غلبۂ حال اور دوسرے عوارض انسانی کے درمیان ایسا واضح فرق وتفاوت بیان کیا جاوے جس سے غیر مشتبہ طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ واقعی اوّل الذکر کا انبیائے کرام علیہم السلام کو کبھی کبھی پیش آجانا بھی ناممکن ہے اور ثانی الذکر قسم کے عوارض پیش آ سکتے ہیں۔ خیال ہے کہ ثانی الذکر قسم کے عوارض کے پیش آجانے کے مولانا بھی قائل ہوں گے اس لیے اس کے دلائل سے صرف نظر کیا گیا۔

آگے چل کر مولانا محترم تحریر فرماتے ہیں:

"روایت کے جس فقرے سے بنوی صاحب کو یہ شبہ ہوا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

فای خزی اخزیٰ من ابی	اے خدا آج اس سے بڑی میری کیا
الا بعد	رسوائی ہوگی کہ میرا باپ تیری رحمتوں
	سے محروم ہے۔

اس فقرہ میں باپ کے لیے مغفرت کی دعا و درخواست دبی زبان میں بھی نہیں ہے بلکہ اپنی رسوائی پر تعجب ہے اور اس سے بچانے کی درخواست ہے چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس کی تدبیر فرمائی اور آزر کو ایک خون آلودہ جانور کی شکل میں منتقل کر کے دوزخ

میں ڈلوادیا۔ جس سے اس بات کی شہرت ختم ہوگئی کہ ابراہیم خلیل اللہ کا باپ جہنم میں ڈالا گیا ہے۔ پس یہی آپ کا منشا تھا۔ اس واقعہ سے اس بات کا خیال بھی نہ کیا جائے کہ خلیل اللہ نے اپنے آپ کو ذہنی اذیت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ سوال کیا کیونکہ عالم آخرت عقائد و اعمال کا عالم ہے خونی رشتوں اور نسبی علائق کا وہاں کوئی اثر باقی نہ رہے گا قرآن کریم نے کہا:

وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَاب کہ ہر تعلق نسبی و ظاہری ٹوٹ جائے گا۔

(البقرہ: ۱۶۶)

قرآن و حدیث میں خون اور نسب کے رشتوں میں ایک دوسرے کی وجہ سے جو درجات کی بلندی اور سفارش کی قبولیت کا ذکر آتا ہے وہاں ایمان اور توحید کی شرط کے ساتھ ہے۔ قرآن نے کہا:

وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ گویا صلاحیت یعنی ایمان کی شرط لگائی گئی۔
وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ (الرعد ۲۳، الغافر ۸)

توحید و ایمان کو بحفاظت لے جانے کے بعد اعمالِ خیر میں جو کمی اور نقص رہ جائے گا اُسے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ماں باپ اور اہل اللہ کی دعاؤں کے ذریعے دور فرمادے گا۔ ایک جلیل المرتبہ پیغمبر آخرت میں باپ کی نسبی محبت سے مغلوب الحال اور بے قابو ہو جائے یہ تصوّر فاضل بنوی کے ذوق کی تسکین کا سامان کیسے بن گیا۔"

اس عبارت کا تعلق موضوع کے دوسرے حصے سے ہے اور اس میں موقف یہ اختیار کیا گیا ہے کہ قیامت میں پیش آنے والی اس صورت حال کی توجیہ میں غلبۂ حال سے مدد لینا قطعی غلط ہے۔ اس قطعیت کے لیے مولانا محترم نے ایک تو اسی آیت سے استدلال کیا ہے جو منقولہ بالا پیراگراف میں مذکور ہے یعنی وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ اور اس کے چند سطروں بعد یہ آیت بھی نقل فرمائی ہے: فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ جن سے مولانا کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کے دن سرے سے خونی رشتے ہی منعدم ہو جائیں گے تو رشتۂ پدریت و پسریت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر غلبۂ حال طاری ہونے کی بنیاد ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ مذکورہ آیات کا بالکل سیدھا سادا اور ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ قیامت کے دن خونی

رشتے کسی کام نہیں آئیں گے۔ آیات کا یہ معنی لینا کہ سرے سے یہ رشتے ہی ختم ہو جائیں گے تو نہ صرف اس ظاہر کے خلاف بلکہ بعض دوسری آیات کے مفہوم سے متصادم بھی ہے مثلاً آیات:

یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ۝

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔

وغیرہا سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان رشتوں کے احساس کے باوجود ایک دوسرے سے کامل بے تعلقی و بے پرواہی پیدا ہو گی اگر یہ طبعی علائق سرے سے محو ہوں تو اجانب کا ایک دوسرے سے بیگانہ و بیزار ہونا تو عام دنیاوی مصیبتوں میں بھی مشاہد ہے۔ اس میں قیامت کی ہولناکیوں کا کیا اختصاص و امتیاز ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ایک مستقل رسالہ میں اس موضوع پر کافی بحث فرمائی ہے کہ نبی علیہ السلام کی قرابت قیامت کے دن ان کے مؤمن قرابت داروں کے لیے تو نفع مند ثابت ہو گی لیکن کفار قرابتداروں کے لیے کسی منفعت کا ذریعہ نہ ہو گی۔ اس بحث میں قرابتوں کے سرے سے نابود ہو جانے کی بات تو کہیں نظر سے نہیں گزری۔ اس تبصرے کو میں علامہ تھانویؒ کی مشہور کتاب "بوادر النوادر" میں شامل ایک مضمون بعنوان "عبور البراری فی سرور الزراری" سے ماخوذ ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ مولانا زراری المشہ کین کے اخروی ٹھکانے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الروایۃ الاولیٰ عائشۃ لو شئت لاسمعتک تضاغیھم من النار یعنی اطفال المشرکین۔ یہ روایت بظاہر دال ہے تعذیب پر کیونکہ تضاغی کسی الم ہی کے سبب ہو سکتی ہے جواب یہ ہے کہ تضاغی کے دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں مثلاً اپنے آباء کی حالت دیکھ کر جیسے دنیا میں مشاہد ہے اگر کسی بچے کے باپ بھائی کو کوئی مارے، بچے رونے لگتے ہیں یا مثلاً باوجود عدم تألم کے احتمال تألم فی المستقبل سے جیسے دنیا میں بھی عدم وقوع خوف کے احتمال خوف سے بچے رونے لگتے ہیں۔ یا مثلاً خود جہنم کا منظر ناپسند کر کے اس سے خارج ہونے کی خاطر الحاح کے لیے جیسے اس کے نظائر دنیا میں بھی

دیکھے جاتے ہیں ۔ غایت مافی الباب اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ بچوں میں بچپن کے بعض جذبات وہاں بھی رہیں گے سو اس کے التزام میں چنداں بُعد نہیں چنانچہ چھوٹے بچے جو اپنے والدین کے بخشوانے کے لیے اَڑ جائیں گے کہ ہم بدون ان کے جنت میں نہ جائیں گے وہاں ارشادِ خداوندی ان لفظوں سے منقول ہے : ایھا السقط المراغم ربہ ادخل ابویکَ الجنۃ ۔ مراغم کا لفظ ان جذبات کے بقاء کو بتلا رہا ہے ۔"

مولانا تھانویؒ تضاعف اولاد المشرکین کی بہت سی توجیہات میں یہ توجیہ بھی بیان فرمائے ہیں کہ مثلاً آباء کی حالت دیکھ کر جیسے دنیا میں مشاہد ہے اگر کسی بچے کے باپ بھائی کو کوئی مارے، بچے رونے لگتے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ مولاناؒ کے نزدیک موقف تو کیا دوزخ تک میں ان انسانی جذبات کا پایا جانا کوئی ناممکن بات نہیں اور اگر میری سمجھ یا حافظے کا دھوکہ نہ ہو تو موقف کے بارے میں تو مولانا تھانویؒ کی تحریرات میں بصراحت یہ بات کہیں مذکور دیکھی ہے کہ وہ عالم عالمِ دنیا کے ساتھ بہت سی چیزوں میں مشارک ومشابہ ہے ۔

اس مبحث کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعینہٖ اسی واقعہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ملّا علی قاری کی توجیہ بھی نقل کر دوں تاکہ معلوم ہو کہ اگر غلبۂ حال کے نافین میں محمود آلوسی جیسے مفسّرین شامل ہیں تو مثبتین میں بھی بلند پایہ علماء و صلحاء کا بالکل فقدان نہیں ہے ۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں متعلقہ حدیث کے الفاظ " فاذا ھو بذیخ متلطخ " کی تشریح کرنے کے بعد اس پر مزید لکھتے ہیں کہ :

والحکمۃ فیہ انہ لمّا یراہ مسخاً لا یخرج من قلبہ محبتہٗ ولان لا یحزنہ ان لو رآہ قد القی فی النار علی صورتہ ۔

حکمت اس میں یہ ہے کہ جب وہ (ابراہیمؑ) اس کو (یعنی باپ کو) مسخ شدہ صورت میں دیکھ لے گا تو اس کی محبت دل سے نکل جائے گی اور تاکہ وہ اس غم سے غمگین نہ ہو جو اس کو اپنے باپ کے انسانی صورت میں جہنّم میں ڈالے جانے کا منظر دیکھنے سے ہوتی ۔

قارئین ذرا احقر کے یہ جملے دوبارہ ملاحظہ فرمالیں کہ " معلوم ہوتا ہے کہ بدنصیب باپ کا یہ فرزندِ سعادت مند قیامت کی اُن ہولناک گھڑیوں میں بھی جبکہ ہر طرف نفسی نفسی کی صدا پکار ہوگی اپنی بے مثال رأفت و رحمت کی بدولت اپنے خطاکار والد کی خطاپوشی کی درخواست

کر بیٹھیں گے اور والد کی بدحالی پر درد کی ٹیسیں اس کے دل میں اس وقت تک برابر اٹھیں گی جب تک کہ مسخ صورت کی ایک خاص تدبیر سے محبتِ پدری کو ان کی سرشت سے کھینچ کر نکال باہر نہیں کیا جاتا۔"

مسخ صورت کی غرض وغایت کے بیان میں اس عبارت اور ملا علی قاریؒ کی صراحت میں سرِ مُو اختلاف نہیں اور ظاہر ہے کہ مسخ صورت کی یہ غرض وغایت جب ہو سکتی ہے جبکہ ابراہیم علیہ السّلام کے دل میں محبتِ پدری کے وجود واحساس کو تسلیم کیا جاوے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ "اس فقرہ میں باپ کے لیے دعا و مغفرت کی درخواست دبی زبان میں بھی نہیں ہے بلکہ اپنی رسوائی پر اظہارِ تعجب ہے اور اس سے بچانے کی درخواست ہے۔"

عرض ہے کہ اگر اس فقرے میں مغفرت کی کسی درجے میں بھی خواہش مذکور نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کے جواب " انی حرمتُ الجنۃ علی الکافرین " کا ماقبل کے ساتھ بے تکلّف جوڑ کیا بنے گا اگر واقعتاً ابراہیم علیہ السلام کا منشأ سوال اس رسوائی سے بچنا اور بچانا ہی تھا جس کی تدبیر بقول مولانا یہ فرمائی گئی کہ آزر کو ایک خون آلودہ جانور کی شکل میں منتقل کر کے دوزخ میں ڈلوا دیا جس سے اس بات کی شہرت ختم ہوگئی کہ ابراہیم خلیل اللہ کا باپ جہنم میں ڈالا گیا ہے تو اس قولی سوال اور عملی جواب کے بیچ میں انی حرمت الجنۃ علی الکافرین کے اضافے کی کوئی معقول وجہ کیا ہوگی۔

موضوع کے دونوں حصّوں پر تبصرہ کرنے کے بعد مولانا اس قرآنی نظیر کی تردید فرماتے ہیں جو احقر نے مولانا تھانویؒ کے حوالے سے مولانا محمد یعقوبؒ صاحب سے نقل کی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں :

"علمائے اعلام نے حضورؐ کے اس فعل (عبداللہ بن ابی منافق پر نمازِ جنازہ پڑھنے) کو دعوتی اور دینی مصلحت سے وابستہ کیا ہے رحمت وشفقت کا یہ بامقصد مظاہرہ تھا۔ اخلاقی مدارات کے طور پر آپ کا یہ فعل رونما ہوا۔

آپ کے دل میں حقیقی طور پر اس منافق کے لیے کوئی محبت وشفقت نہ تھی اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران ۲۸) کی تفسیر میں کفار کے ساتھ اخلاق و مدارات کی جو نوعیت بیان کی گئی ہے اُس کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا تھانویؒ کی طرف سے مولانا محمد یعقوب صاحب کے حوالے سے غلبۂ حال کی جو

بات نقل کی گئی ہے وہ صرف ایک صوفیانہ نکتہ ہے کوئی تحقیقی بات نہیں ہے ورنہ مولانا تھانویؒ بیان القرآن میں اس کا حوالہ دے سکتے تھے۔"

مولانا کے اس حصہ مضمون کو پڑھتے ہوئے تو (خدا شاہد ہے کسی طنز و تعریض کے طور پر نہیں کلا و حاشا و اقعتاً) میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ اگرچہ میرا موجودہ ماحول بھی ایسی علمی تحقیقات کے لیے سازگار نہیں لیکن اس ذہنی پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے لازماً خلاف ماحول بھی کتابوں کی ورق گردانی پر تیار ہو جاتا لیکن افسوس کہ مجھے مستند علمی کتابیں بھی میسر نہیں نمازِ جنازہ جس کی اصلیت الثناء للہ تعالیٰ والدعاء لھذا المیت ہے اور جو دوسری نمازوں کی طرح ایک عبادت ہے خدا کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار سے اخلاق و مدارات کی خاطر اس کی ایسی خلاف وضع استعمال پہ آمادہ ہو جائے۔ صلبِ عبادت میں اخلاق و مدارات کی خاطر ایسی تبدیلی کی کوئی دوسری نظیر بھی مولانا محترم پیش فرما سکیں گے۔ کیا اس کی یہ توجیہ قابلِ قبول نہیں کہ ممکن ہے غلبۂ حال کی وجہ سے الدعا لھذا المیت کے ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کو اپنی پیغمبرانہ فراست سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ اس فعل سے بہت سے کفار بھی متاثر ہوں گے جیسے کہ یہ واقعہ بھی ہوا کہ ایک روایت کے مطابق قبیلہ خزرج کے ایک ہزار افراد نے اس واقعہ کے بعد اسلام قبول کیا۔

رہی یہ بات کہ یہ ایک صوفیانہ نکتہ ہے تو عرض ہے کہ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ بالکل بے اصل ہے تو اپنے بزرگوں کے متعلق ہمارے لیے یہ باور کرنا تو بہت مشکل ہے کہ وہ محض بے اصل باتوں کو لوگوں کے مجمع میں بیان کریں گے اور اگر یہ مراد ہے کہ یہ بات کمزور ہے تو تسلیم ہے لیکن مولانا محترم کے انداز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کوئی توجیہ سرے سے ناممکن اور محال ہے جس کا حاصل نہ صرف بے اصل بلکہ خلاف اصل اور مناقض اصل نکلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکیم الامۃ کے کلام میں اس نوع کی لایعنی بحث کی گنجائش تو نہیں ہو گی۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور رحمۃ للعلمین ﷺ (۶)

اسلام کے غلط اندیش مصلحین

اس زمانہ میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہوگیا ہے جن کی رغبت اسلام سے کم اور مغرب کے ناقص، غلط اور غیر اسلامی نظریات سے زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے کالجوں کی تعلیم و تربیت لادینی اور بے خدا ہے اور انسانی زندگی کے متعلق لادینی اور بے خدا نقطۂ نظر پیدا کرتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مغرب کے غیر اسلامی نظریات غلط اور نامعقول ہونے کے باوجود ایک ظاہری شان و شوکت اور چمک دمک رکھتے ہیں۔ ایسے غلط نظریات کے پرستار اور اسلام سے بیزار مسلمانوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلام کی ایسی توجیہہ کریں جو اسلام کو ان کے غلط مگر پسندیدہ نظریات کے مطابق بنا دے یا قریب لے آئے۔

لہٰذا وہ کسی استاد کی راہ نمائی کے بغیر اسلام سے سطحی اور جزوی واقفیت پیدا کرنے کے بعد اسلام کے مصلحین یا ریفارمرز کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں اور اجتہاد کے نام پر اسلام میں ردّ و بدل کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ عام مسلمان ان کی مذہبی قیادت کو قبول کریں گے۔ اپنے آپ کو یوں بلا وجہ غیر معمولی سمجھ بوجھ کا مالک قرار دے لینے کے بعد وہ ایک طرف سے تو دیندار اور پرہیزگار مسلمانوں کو کوستے ہیں کہ وہ مُلّا اور متحجر اور جامد ہیں اور زمانے کے ساتھ نہیں بدلتے۔ اور دوسری طرف سے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ قرآن حکیم پر ان کے تشریحی اور تفسیری نکات نہایت ہی جدید اور اچھوتے ہیں۔ اسلام مٹ چکا تھا لیکن ان کے قلم کی جدّت طرازیوں نے اسے پھر زندہ کر دیا ہے۔

اجتہاد کی شرائط

حالانکہ اجتہاد صرف ایسے مسائل میں ہو سکتا ہے، جن کے بارے میں خدا اور رسولؐ کے ارشادات

کے اندر پہلے کوئی راہ نمائی موجود نہ ہو اور بعض نئے غیر متوقع حالات کے اندر اسلام کے مطابق عمل کرنے کے لیے خود اسلام ہی کی تعلیمات کی روشنی میں اور اس کی رُوح کے مطابق نئے اصول اور قواعد وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ صحیح اور بے خطا اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کرنے والا نہ صرف اسلام کی پُوری تعلیمات سے اور اس کے احکام کی ساری علّتوں اور حکمتوں سے باخبر اور اس کی روح سے آشنا ہو بلکہ اس کے دل میں خدا اور اس کے رسول اور اسلام کی محبّت بھی درجۂ کمال پر ہو۔ اگر اس کی محبّت کامل نہ ہوگی تو جس حد تک وہ کامل نہ ہوگی اُس حد تک اس کے دل میں غلط اور غیر اسلامی نظریات اور تصورات کی محبّت سمائی ہوئی ہوگی، جو اس کی بصیرتِ اسلامی کو خطا سے ملوّث کرے گی اور اس کے اجتہاد کو غلط اور ناقص بنائے گی لیکن خدا کی محبّت کو وہی شخص درجۂ کمال پر پہنچا سکتا اور قائم رکھ سکتا ہے جو عبادت و ریاضت، تقویٰ و پرہیزگاری اور توبہ و استغفار کو اپنا شعار بنائے۔

اجتہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اپنی کور ذوقی کو مطمئن کرنے کے لیے ہم ان احکام کو ہی بدل ڈالیں جو بارگاہِ ایزدی یا دربارِ رسالت سے صادر ہو چکے ہوں۔ ایسا کرنا اجتہاد کی اجازت کا نہایت ہی غلط استعمال ہے جو انکارِ نبوت یا دعویٰ نبوت سے کم مذموم نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک خوبصورت شہر کے رہنے والے کسی شخص کو اجازت دے دی گئی ہو کہ جہاں کہیں کھلی زمین پائے عمارتیں بنائے لیکن وہ اس اجازت کا استعمال یُوں کرے کہ کھلی زمین میں تعمیر کرنے کی بجائے شہر کی ایسی خوبصورت عمارتوں کو جو اس کے بگڑے ہوئے ذوق کے مطابق نہ ہوں گرا کر نئی بدصورت عمارتیں بنانے لگے۔ ایسے اشخاص کے متعلق ہی اقبال نے کہا ہے۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مُفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!